بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

گزشتہ اشاعت میں ہم نے صدر مملکت جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کی تصنیف "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کے متعلق چند ملاحظات پیش کیے تھے۔ ان صفحات میں ہم اسی سلسلے کے بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

صدر صاحب نے ستر صفحات پر پھیلے ہوتے دو ابواب میں ناصی تفصیل کے ساتھ پاکستان کی خارجہ پالیسی پر بحث فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انہوں نے اس پالیسی کے تشکیل دینے میں کن مصالح کو پیش نظر رکھا ہے، اُن کی بصیرت اور تدبر نے بیرونی دنیا میں پاکستان کا وقار کتنا بلند کیا ہے، اور یہ کہ پہلے حکمرانوں سے اس معاملے میں کیا کیا لغزشیں سرزد ہوئیں اور ان کی وجہ سے پاکستان کو کیا نقصان پہنچا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے انہوں نے یہ بتایا ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے دو اہم مقاصد ہیں ایک ملک کی سلامتی اور دوسرے ترقی۔ پھر انہوں نے ترقی کی تصریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم محض ترقی کے خواہشمند نہیں بلکہ اُس ترقی کے آرزومند ہیں جو ہمارے دین اور مذہب کے مطابق ہو۔ (ص ۱۱۴)

اس کے بعد انہوں نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ موجودہ دنیا دراصل دو یا تین یا چار بڑی طاقتوں کی دنیا ہے۔ نوعِ بشری کی قسمت کے فیصلے انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ چھوٹے ممالک، جنہیں حال ہی میں آزادی حاصل ہوئی ہے، ابھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور اپنی دنیا خود آباد کرنے کے قابل نہیں ہوئے۔

محولہ بالا دو مقاصد اور دنیا کی موجودہ صورتِ حال کو سامنے رکھ کر انہوں نے پاکستان کے خارجی مسائل کا جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں ہندو ذہنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے دلائل کے ساتھ یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس قوم نے پاکستان کے وجود کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور وہ اول روز ہی سے اس تاک میں لگی

ہوتی ہے کہ کسی طرح اس ملک کو مٹا دیا جائے پھر انہوں نے بھارت کی ریشہ دوانیوں، وعدہ خلافیوں اور کشمیر کے معاملے میں اُس کی فریب کاریوں پر بھی خاصی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

اس بحث کے سلسلے میں انہوں نے پاکستان کی اور دنیا کی صورتِ حال کا جو جائزہ پیش کیا ہے اُس کے مطالعہ سے ہمیں اپنی کمزور پوزیشن اور معاشی پس ماندگی کا سخت احساس ہوتا ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمیں اپنے تحفظ و بقا اور توسیع و ترقی کے لیے لازماً دوسروں کا دست نگر ہونا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک وقت ہم ایک کے محتاج ہوں اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے دوسرے وقت کسی دوسرے کے محتاج ہو جائیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۵۴ء میں جب پاکستان بغداد پیکٹ اور سیٹو میں شریک ہوا تو یہ محض حالات کی مجبوری تھی:

"صبحِ آزادی طلوع ہونے کے ساتھ ہی پاکستان اپنے تحفظ اور بقا کے لیے ایک شدید اور طویل جنگ میں اُلجھ گیا اور ۱۹۵۴ء تک وہ اپنی سلامتی کے لیے مغربی طاقتوں کا حلیف بننے پر مجبور ہو گیا۔" (ص ۱۱۶)

اور اب خارجہ پالیسی میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ بھی بدلے ہوئے حالات کے دباؤ کا نتیجہ ہے (ص ۱۱۷)۔ آگے چل کر انہوں نے بڑی صفائی کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ امریکہ شروع ہی سے اس بات کا متمنی ہے کہ شرقِ اوسط میں اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کے لیے ایک محاذ قائم کرنا چاہیے اور یہ محاذ دنیائے اسلام سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اشتراکیت کے خطرے نے تاریخ میں پہلی بار مسیحی دنیا کو دنیائے اسلام کی امداد پر آمادہ کیا ہے۔ مسلمان اس کرۂ ارضی کے ایسے حصے میں آباد ہیں جو معاشی اور فوجی نقطۂ نظر سے بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی بنا پر امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک نے مسلمانوں کو دوست بنانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف دنیائے اسلام اُس وقت مغربی طاقتوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کر رہی تھی۔ اس حالت میں اسے اپنے انسانی اور مادی وسائل کی ترقی کے لیے مادی

اسباب، فرصت اور صنعتی مہارت درکار تھی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں پس و پیش کرتے۔ ہمارے لیے خود اپنی توسیع و ترقی کے لیے اپنی ضروریات سب سے بڑھ کر اہمیت رکھتی تھیں اور یہ تھی وہ وجہ جس کی بنا پر ہم نے ان معاہدوں (سیٹو اور سنٹو) میں شمولیت اختیار کی۔"

(ص ۱۵۴)

اس کے بعد ص ۱۵۷ پر انہوں نے علاقائی تعاون برائے ترقی (R.C.D) کا ذکر کرتے ہوئے بغداد پیکٹ کی اہمیت بتائی ہے اور صاف کہا ہے کہ یہی پیکٹ تھا جس نے آر۔سی۔ڈی کے قیام کے لیے راستہ ہموار کیا۔

ہمارے سامنے ایک طرف صدر صاحب کی یہ تصریحات ہیں۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ان معاہدوں کی مخالفت بھی فرما رہے ہیں۔ مثلاً سیٹو کے بارے میں اُن کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

"مجھے اُن وجوہ کا کچھ علم نہیں جو سیٹو میں حکومتِ پاکستان کی شمولیت کے محرک ہوئے۔ اس بارے میں تو چوہدری ظفراللہ ہی سے دریافت کرنا چاہیے جو اُس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ ہم سپاہیوں سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔ مجھے خیال ہے کہ جنرل ہیڈ کوارٹرس میں ہمیں اس کا اُس وقت پتہ چلا جب وزیر خارجہ اس معاہدہ پر دستخط کر چکے تھے۔ اُس وقت بھی میری یہ رائے تھی کہ اس معاہدے میں پاکستان کے شریک ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ غالباً یہ کام زیادہ تر امریکہ کی خوشنودی کے لیے کیا گیا تھا، کیونکہ وہ ہمیں معقول معاشی امداد دے رہا تھا۔ اس کے سوا مجھے اس معاہدے میں شریک ہونے کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ اس تنظیم کی رکنیت کسی حیثیت سے پاکستان کے مشرقی حصے کی پوزیشن مضبوط کریگی تو ظاہر بات ہے کہ اس نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ مشرقی پاکستان کو تو اصل خطرہ ہندوستان سے ہے جو اسے تین طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔" (ص ۱۵۷)

ان دونوں قسم کے بیانات کو جو شخص بھی پڑھے گا وہ یقیناً ان کے اندر ایک تضاد محسوس کرے گا۔ متعدد مقامات پر وہ ان معاہدوں کو پاکستان کی ناگزیر ضرورت بھی بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف بعض

مشرقی ممالک کے درمیان تعاون کی راہ ہموار کی ہے بلکہ امریکہ سے فنی اور معاشی امداد کے لیے بھی ایک راستہ کھول دیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ان کی مخالفت میں بھی دلائل دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان معاہدوں کی وجہ سے روس ہم سے ناراض ہو گیا اور عرب ممالک، خصوصاً مصر اور اس کے ساتھیوں نے بھی ہمیں امریکہ کا پٹھو سمجھتے ہوئے ہم سے منہ موڑ لیا اور وہ ہمارے مقابلے میں بھارت کی طرف جھکنے لگے۔

صدر صاحب نے ان معاہدوں کے خلاف جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے، ان سے واقعی دنیا میں ہماری پوزیشن خراب ہوئی ہے اور بعض قوموں کے دلوں میں ہمارے خلاف ایسے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں کہ ابھی تک کوشش کے باوجود ہم انہیں دور نہیں کر سکے۔ مگر ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے باوجود وہ ابھی تک ان معاہدوں سے کیوں آزاد نہیں ہوتے۔ یہی حکومتوں نے اگر ان معاہدوں میں شمولیت کی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کی افادیت کی قائل تھیں لیکن اب تو تجربہ سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ یہ معاہدے ہمارے لیے محض بیکار کی زنجیریں ہیں جن سے ہمیں اچھا خاصا نقصان پہنچا ہے، اور صدر صاحب خود واشگاف طریقہ سے ان کے ضرر رساں پہلوؤں کو بیان کر رہے ہیں۔ اب ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس احساس اور بر ملا اعتراف کے باوجود وہ ان معاہدوں سے اپنے آپ کو الگ کرنے پر کیوں آمادہ نہیں ہو رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اپنے اس موقف پر روشنی ڈال کر ان الجھنوں کو دور کر دیتے جو ان کے یہ مختلف ارشادات پڑھنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔

صدر مملکت نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں جتنی باتیں کی ہیں ان میں بعض ناقابل تردید حقائق کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک حقیقت دنیا کی غیر مسلم قوموں کی اسلام دشمنی ہے۔ کفر کی صفوں میں خواہ کتنا ہی اختلاف اور انتشار ہو، اسلام کے مقابلے میں وہ بالکل متفق اور متحد ہیں۔ کفر کی اس روش کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"کاسابلنکا سے لے کر جکارتہ تک کے علاقے میں جتنے ممالک پائے جاتے ہیں وہ دنیا

کی بڑی طاقتوں کی نظر میں مشکوک بھی ہیں کیونکہ ان کی عظیم اکثریت دین اسلام کی پیرو ہے۔ اسلام کے بارے میں خود ان مسلم ممالک کے درمیان اندرونی طور پر جو کچھ بھی اختلاف ہو، اور ہر ایک نے اسلام کے متعلق جو نقطۂ نظر بھی اختیار کیا ہو، بہرحال یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ اشتراکی دنیا، مسیحی دنیا اور ہندو بھارت، سب کے سب مسلم ممالک کے ساتھ انہیں مسلم سمجھ کر ہی معاملہ کرتے ہیں۔" (صـ۱۸۳)

ایک اور مقام پر وہ پاکستان کے مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ پاکستان کی حفاظت ہمیں خود ہی کرنی ہوگی۔ کوئی دوسرا ملک ہماری طرف سے مدافعت نہیں کرے گا .... دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو اپنے مسائل درپیش ہیں اور حالات کے تغیر سے اُن کے طرزِ عمل میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اس طرح ہم بالکل بے یار و مددگار بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ نازک مقام ہے جہاں قادرِ مطلق ہی ہماری دستگیری کر سکتا ہے۔" (صـ۱۲۱)

غیر مسلم ممالک کی اسلام دشمنی کے متعلق یہ ارشادات بالکل بجا ہیں اور مسلمانوں کو اپنی قوتِ ایمانی اور اپنے وسائل پر جینے کی یہ تلقین بالکل درست ہے۔ مگر صدر صاحب کی کتاب کے ان دو ابواب کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس واقعی صورتِ حال کو جانتے ہوئے بھی وہ ابھی تک مغربی قوموں سے مایوس یا بدظن نہیں ہوئے ہیں بلکہ ایک طرف انہیں برابر اپنی وفاداری کا یقین دلا رہے ہیں اور دوسری طرف اپنی قوم کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ دنیا، جس میں ہم رہتے ہیں، وہ چار طاقتوں کی دنیا ہے، ان کی معاونت اور دستگیری کے بغیر ہمارا زندہ رہنا اور ترقی کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس ضمن میں اُن کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

"ترقی کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے اُس کے لیے ذرائع موجود ہوں۔ اور یہ سارے ذرائع ہمارے موجودہ معاشرتی حالات اور ہمارے نظامِ اقدار میں محض حکم چلا کر نہ پیدا کیے جا سکتے

ہیں تحریک میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس لیے لامحالہ ہمیں اجتماعی تعمیر کے اٹھان اور ابتدائی سرمایہ کاری کی فراہمی کے لیے بیرونی امداد کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کی وجہ سے ہمارے لیے امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا ضروری ہے جو معاشی طور پر ہماری مدد کر سکتی ہیں۔" (ص ۱۱۸)

یہاں اور بعض دوسرے مقامات پر صدر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اُس سے ہمیں اپنی مجبوری کا سخت احساس ہونے لگتا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان مغربی طاقتوں کی مدد کے بغیر ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے، خواہ ہمارے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہی معاندانہ اور غیر منصفانہ ہو اور خواہ وہ مسلمان ہونے کی بنا پر ہم سے کیسا ہی تعصب برتیں۔ اس مجبورانہ دست نگری کے بعد مشکل ہی سے ہم کسی آزاد خارجہ پالیسی کا تصور کر سکتے ہیں۔

اسی ضمن میں صدر محترم نے یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی ہے کہ دورِ جدید میں اگر قومیں خود اپنے وسائل کے بل بوتے پر زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی خواہشمند ہوں تو اس کی صورت بس ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ اقدار کا موجودہ نظام درہم برہم کر کے اُس کی جگہ ایک ایسا نظام لایا جائے جو فرد کو اجتماعی نظم و ضبط کی جکڑبندیوں میں پوری طرح کس کر اُس سے کام لے۔ واضح الفاظ میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ صدر صاحب کی نگاہ میں اب ہمارے لیے توسیع و ترقی کی صرف دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو ہم مغربی طاقتوں کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے اُن سے مدد مانگتے رہیں۔ یا پھر اپنی تہذیب و تمدن کو خیرباد کہہ کر اُس کی جگہ اشتراکی نظام اپنے ہاں رائج کر دیں۔ ہم حیران ہیں، کیا واقعی اب مسلم قوم کی بقا و فلاح کے صرف یہی دو راستے رہ گئے ہیں؟ صدر صاحب نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر اسلام کی بے حد مدح و ستائش کی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اقدار کے موجودہ نیم اسلامی اور نیم غیر اسلامی نظام کو ختم کر کے ان کی جگہ اپنے ہاں صحیح معنوں میں مکمل اسلامی نظام اقدار نافذ کریں اور قوت و طاقت کے اُس اتھاہ خزانے سے، جس کی جڑیں ہمارے دل و دماغ کی گہرائیوں میں موجود ہیں، زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر اپنے وسائل کے بل بوتے پر زندہ رہنے کے ڈھنگ سیکھیں؟ مسلم قوم قدرتی ذرائع کے اعتبار سے اتنی قلاش اور ہمت کے اعتبار سے اتنی پست نہیں ہے کہ غیروں

کے سہارے کے بغیر اس کا جینا قطعاً ممکن نہ ہو۔ پھر اُس کا نظام اقدار بھی کوئی ایسا بیکار اور لایعنی نہیں کہ اُسے مٹائے بغیر ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکتا ہو۔ اِسی نظام کی قوت سے اس نے قریب قریب آٹھ سو سال تک دنیا کی فکری اور عملی رہنمائی کی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس نظام کو دل و جان سے اپنا لیا جائے۔

اِس طرح کی مجبوری اور لاچاری کی باتیں ممکن ہے سابق حکمرانوں کو زیب دیتی ہوں جن کی نااہلی اور کمزوری پر صدر صاحب نے خود شہادت دی ہے۔ مگر صدر صاحب جیسے طاقتور اور صاحبِ عزم و حوصلہ شخص کو تو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ اور ان کی نگاہ سے یہ تاریخی حقیقت بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ کسی قوم نے دنیا میں غیروں کی نقالی اور دستگیری سے عزت کا مقام کبھی حاصل نہیں کیا ہے۔ مدد دینے والا کبھی مدد لینے والوں کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ اس کی محتاجی سے آزاد ہو جائے۔ اور کوئی قوم جو اپنی کوئی تہذیب اور اپنا کوئی نظامِ اقدار رکھتی ہو، باہر سے لایا ہوا ایک نظامِ حیات درآمد کر کے انتشار و خلفشار کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتی۔ اس معاملہ میں ہمارا اپنا ۲۰ سال کا تجربہ اور شرقِ اوسط کے بعض ملکوں کا تجربہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اِس کتاب کے اِن دو ابواب کے مطالعہ سے قاری ایک مقام پر نہیں بلکہ کئی مقامات پر اِسی نوعیت کی اُلجھن محسوس کرتا ہے۔ کبھی تو اُس کو یہ تاثر ملتا ہے کہ دنیا کی ساری غیر مسلم قومیں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتتی ہیں، اُن پر کسی حالت میں اعتماد نہ کرنا چاہیے اور اللہ پر بھروسہ کر کے خود اپنی ہمت اور طاقت سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور کبھی یہ تاثر ملتا ہے کہ ان بڑی قوموں کی معاونت اور دستگیری کے بغیر ہماری ترقی تو درکنار ہمارا جینا بھی ناممکن ہے، ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ بس یہ کہ سب کو خوش رکھنے کی کوشش کریں تاکہ کسی آستانے سے خالی ہاتھ واپس نہ آئیں۔ یہ غالباً اسی تذبذب کا نتیجہ ہے کہ صدرِ محترم امریکہ کے ناپاک عزائم اور ماضی میں اُس کے ناقابلِ اعتماد کردار اور مستقبل کے تشویشناک رجحانات کو جانتے ہوئے بھی اُس کے بارے میں کوئی فیصلہ کُن پالیسی طے نہیں کر سکے۔ امریکہ نے جس طرح پاکستان کے مفادات کو نظرانداز کرتے

ہوتے بھارت کو اسلحہ فراہم کرنا شروع کیا اُس سے اُس کے خبثِ باطن کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خود صدرِ محترم نے اپنی تصنیف میں اس کا بار بار ذکر فرمایا ہے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے ۱۹۶۱ء میں امریکی کانگرس کو خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا:

"وہ قوم جو ہمیشہ آپ کا ساتھ دیگی وہ صرف پاکستانی قوم ہی ہے۔۔۔۔ بشرطیکہ آپ بھی اس کے ساتھ کھڑے ہونے کو تیار ہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کی معاہدانہ ذمہ داریوں کے تقاضے خواہ کچھ بھی ہوں، آپ ایسا کوئی قدم نہ اٹھائیں جس سے ہمارے مسائل کی الجھنیں بڑھ جائیں یا کسی طرح ہماری سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ اگر آپ اس بات کا پاس کرتے رہیں گے تو مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہماری دوستی مضبوط تر ہوتی جائے گی (ص ۱۳۰)

یہ معاملہ صرف زبانی یقین دہانی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ صدرِ محترم نے بعض فیصلہ کن مواقع پر وہی اقدام کیا ہے جس کا امریکہ خواہشمند تھا۔ ہم یہاں صرف اس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں جسے صدر صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

جب بھارت اور چین کے درمیان آویزش شروع ہوئی تو امریکہ کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں پاکستان اس موقع پر کشمیر کا جھگڑا اٹھا کر بھارت کو پریشان نہ کرے۔ اس لیے وہ اس بات کا خواہشمند تھا کہ پاکستان کا سربراہ بھارت کو اس امر کا یقین دلا دے کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے گا جس سے اُس پر کسی قسم کا دباؤ پڑے۔ صدرِ محترم نے بھارت کی وعدہ خلافیوں اور زیادتیوں کے متعلق نومبر ۱۹۶۲ء میں صدر کینیڈی کو ایک زوردار خط تحریر کیا، مگر اس کے ساتھ ہی امریکہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بھارت کو بھی ایک خط لکھ بھیجا جس میں اُس کے دلی اضطراب کو سکون سے بدلنے کی پوری طرح کوشش کی گئی تھی۔ امریکہ کو اس پر بھی اطمینان نہ ہوا اور اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ صدر ایوب خود پنڈت نہرو سے ملاقات کر کے انہیں اطمینان دلائیں۔ چنانچہ ہمارے صدرِ محترم نے ایسا ہی کیا اور ۷ نومبر ۱۹۶۲ء کو ان دونوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس کا متن یہ تھا:

"پاکستان کے صدر اور بھارت کے وزیر اعظم اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ کشمیر اور بعض دوسرے امور کے بارے میں اُن کے درمیان جو اختلافات ہیں انہیں دُور کرنے کے لیے از سرِ نو کوشش کی جائے تاکہ بھارت اور پاکستان امن اور دوستی کے ساتھ زندہ رہیں۔" (ص ۱۴۹)

صدر صاحب خود جانتے تھے کہ بھارت کشمیر کے مسئلے میں پاکستان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے پر کتنا کچھ آمادہ ہو سکتا ہے۔ اور ان سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ امریکہ کا رویّہ اب کشمیر کے معاملہ میں کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے امریکہ کو راضی رکھنے کے لیے نہرو صاحب کے ساتھ متفق ہو کر اس اعلان پر دستخط کر دیئے۔ وقت گزر جانے کے بعد بھارت نے کشمیر کا مسئلہ سلجھانے کی جیسی کچھ کوشش کی اس کے متعلق صدر صاحب کا اپنا بیان یہ ہے:

"بھارت والے محض وقت گزارنا چاہتے تھے۔ وہ مغرب سے اسلحہ کی بھاری مقدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کی یہ قیمت کوئی بڑی قیمت نہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسے مشترکہ بیان پر دستخط کر دیئے جس میں کشمیر کے مسئلہ پر بس گفتگو کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ہمیں (گفت و شنید کے دوران میں) اچھی طرح معلوم تھا کہ امریکہ کی براہِ راست دلچسپی کے بغیر ہندوستان (کشمیر کے معاملہ میں) اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہ ہوگا، مگر امریکہ کا خیال یہ تھا کہ بحالات موجودہ امریکہ کا اس گفت و شنید میں براہِ راست حصّہ لینا مفید نہ ہوگا۔ اس طرح تاریخ نے جموّں اور کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے جو زرّیں موقع فراہم کیا تھا وہ ضائع ہو گیا۔" (ص ۱۵۲)

امریکہ نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں کیا بلکہ خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان کو پریشانی سے بچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد میں وہ کامیاب ہو گیا۔ صدر محترم اسے امریکہ کے غلط اندازے سے تعبیر فرماتے ہیں، لیکن یہ اُس کا غلط اندازہ نہ تھا بلکہ سوچی سمجھی چال تھی جو وہ بڑی کامیابی کے ساتھ چل گیا اور ہمیں بعد میں اس بات کا پتہ چلا کہ ہم نے زرّیں موقع کھو دیا ہے۔

خارجہ پالیسی کے بعد صدرِ محترم نے پاکستان کی آئیڈیالوجی اور دستور پر مفصل بحث فرمائی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ اسلام ایک ایسا جامع نظامِ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے اور اسی کو ہمارے دستور اور آئین کی اساس اور بنیاد ہونا چاہیے مگر اس معاملے میں چند اُلجھنیں درپیش ہیں جنہیں ہمیں دُور کرنا ہے۔ یہ بحث صدر صاحب کی کتاب کا بڑا اہم حصّہ ہے، اس لیے ہم پُوری احتیاط کے ساتھ اس کو سمجھنے اور اس کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ سب سے پہلے ہم ان کا تصورِ دین پیش کرتے ہیں جسے انہوں نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"اسلام زندگی کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اسلامی نظامِ شریعت ایک پوری تہذیب کا ضابطہ ہے۔ آخر یہ ممکن بھی کیسے ہے کہ انسانی زندگی کو مذہب اور مادّی معاملات کے دو الگ خانوں میں بانٹ دیا جائے اور دونوں خانوں کے قوانین جُدا جُدا ہوں؟ اسلام میں سارے انسانی افعال ایک ہی اصُول کے مطابق طے پاتے ہیں جب حیاتِ انسانی وحدت ہے تو اس کے آئین وضوابط میں بھی وحدت ہی ہونی چاہیے۔ ایک انسان خواہ گھر میں ہو، خواہ اپنے کام پر ہو، یا عبادت میں مشغول ہو، ایک ہی نوعیت کا ضابطۂ حیات اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ جن اصولوں کے مطابق ہم اپنے گھر کے معاملات طے کرتے ہیں وہی دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہمارے مشعلِ راہ ہوتے ہیں۔ اسلام میں روز مرّہ زندگی کے ضابطۂ اخلاق سے الگ کوئی دوسرا خاص روحانی ضابطہ نہیں ہے۔ انسان کے بارے میں بحیثیت مجموعی ہی فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کے اعمال کی قدر و قیمت اخلاقی نقطۂ نظر ہی سے متعیّن ہوتی ہے۔" (ص ۱۹۵-۱۹۶)

اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسلام آج بھی ایک انقلاب انگیز قوتِ فکر و عمل ہے اور وہ ترقی کی راہ میں مزاحم ہونے کے بجائے انسان کو اُس کے لیے آمادہ کرتی اور ابھارتی ہے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ پاکستان مسلمانوں کی دینی آرزوؤں اور اُمنگوں کا مظہر ہے اور یہاں اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظریہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی سلسلے میں انہوں نے مغربی افکار و نظریات سے متاثر جدید طبقوں اور قدیم طرز کی تعلیم سے بہرہ مند علماء کی فکری آویزش

کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے اور اس بات پر حیرت ظاہر کی ہے کہ جب یہ دونوں گروہ اسلام کو دل و جان سے مانتے ہیں اور دونوں پاکستان کو ایک طاقتور اور ترقی پذیر ملک دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو ان کے درمیان اس قدر سخت نزاع و اختلاف کیوں ہے۔ (صـ۱۹۵)

ان حقائق کو بیان کرنے کے بعد وہ اُس بیماری کا کھوج لگانے کی کوشش کرتے ہیں جس نے ہمارے معاشرے کی فطری وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس معاملے میں وہ فساد کے اصل مرکز کی بالکل صحیح طور پر نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عمل کے میدان میں ہماری زندگی دو مختلف دائروں میں بٹی ہوئی ہے اور ہم ہر دائرے میں الگ الگ اصولوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم کس طرح اس دلدل سے نکل کر زندگی کے بارے میں ایک مربوط اور یکساں روش اختیار کریں۔ اگر ہم اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہے تو ہماری ترقی رُک جائے گی اور ہم زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ پس ماندگی اور غلامی دونوں مترادف الفاظ ہیں اور ذاتی تجربے سے ہم اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔" (صـ۱۹۶)

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ صدرِ محترم اسلام کو ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی سمجھتے ہیں۔ زندگی کو دو الگ شعبوں میں تقسیم کرنا اور مذہب کو صرف ایک شعبے تک محدود رکھ کر باقی معاملات کو اس سے آزاد رکھنا ان کے نزدیک غلط ہے۔ مسلم معاشرے میں جدید و قدیم کی آویزش پر بھی انہیں دلی افسوس ہے اور وہ اس خلیج کو پاٹنے کے آرزومند ہیں۔ وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے ان مختلف طبقوں میں فکر و عمل کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی اختلاف ہو مگر بنیادی اصول اور مقصد میں ان کے درمیان اتفاق ہے۔

اس کے بعد وہ اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ ہم کس طرح دورِ جدید میں اپنے معاشرے کو اسلامی نظامِ حیات کا نمونہ بنائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی اصولوں کو چھانٹ کر متعین کر دینے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم علماء کی مدد سے یا ان کی مدد کے بغیر ان کو خود متعین کریں اور فرمان

(DECREE) کے ذریعہ سے ان کو نافذ کر دیں، مگر میں نے اس راستے کو اختیار نہیں کیا (ص ۱۹۷ ۱۹۸)۔

پھر جو دوسرا راستہ انہوں نے پسند کیا اس کی تشریح وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اب مسئلہ یہ ہے کہ قوم اسلامی اصولوں کا کس طرح ٹھیک ٹھیک تعیّن اور ادراک کرے۔ اس کے لیے کوئی واضح اور تشفی بخش جواب نہ تھا۔ اسلامی دستور کی کوئی نظیر بھی نہ ملتی تھی۔ قرآن مجید نے اس سلسلے میں کچھ رہنما اصول دیئے ہیں مگر ملک کے معاملات چلانے کے لیے اُس نے کوئی جامع دستور مرتب نہیں کیا۔ رسول اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انداز پر مملکت کی تشکیل کی اُس کی تفصیل البتہ ہمیں معلوم ہے۔ حضورؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد چاروں خلفاء نے اپنی فہم و فراست کے مطابق اسلامی اصولوں کی روشنی میں مملکت کا نظام چلایا۔ ان میں ہر ایک نے اپنے حالات کے مطابق اسلام کے اصولوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا انطباق کیا۔ مگر اسلامی حکومت کے کوئی متعیّن خطوط نہ تھے کہ سربراہِ مملکت کے انتخاب کے متعلق بھی کوئی لگا بندھا طریق کار طے نہیں کیا گیا۔ اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے حکومت کا کوئی خاص ڈھانچہ تجویز نہیں کیا ہے بلکہ اس معاملے کو ملت پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے اپنا طریقِ حکومت خود وضع کرے بشرطیکہ قرآن اور سنت کے اصولوں کی پیروی کی جاتی رہے۔ قریب کے زمانے میں متعدد مسلمان ممالک نے اس بات کا دعویٰ کیے بغیر کہ انہوں نے ایک ایسا اسلامی دستور مرتب کیا ہے جو تمام مسلمان ممالک میں نافذ کیا جا سکتا ہے، اپنی ضروریات کے مطابق کچھ دساتیر وضع کیے ہیں میرے سامنے یہ بات بالکل واضح تھی کہ پاکستان کو اپنے حالات پر اسلامی اصولوں کے انطباق کی شکل تجویز کرنی ہوگی۔ پھر یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ یہ کام جمہوریّت کے مسلّمہ طریقوں پر ہونا چاہیے جن میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ ملک کے باشندے ملک کے معاملات میں حصّہ دار ہوں۔ عوام کا یہ حق کہ وہ منتظم ہوں اور اپنے معاملات کو خود چلائیں، ایک ایسا حق ہے جسے نہ تو کسی طرح محدود کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی مصالحت کی جا سکتی ہے۔ کوئی فرد یا گروہ

خواہ وہ کتنا ہی ذی علم کیوں نہ ہو اس بات کا مجاز نہیں ہو سکتا کہ وہ قوم کی اُس رائے پر حکم بن کر بیٹھے جس کا وہ اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ سے اظہار کرتی ہے۔ یہ سب باتیں اس امر کو طے کر دیتی ہیں کہ مجلسِ مقننہ کو بالاتری حاصل ہونی چاہیے جو عوام کے لیے عوام کی طرف سے کام کرے، اور اِس سے یہ بات بھی طے ہو جاتی ہے کہ عوام کو اپنے نمائندے اور حکومت کے لیڈر منتخب کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ نیز اس بات کا اطمینان کرنے کے لیے کہ انتظامیہ اور مقننہ دستور کے مطابق کام کر رہی ہیں، ایک آزاد عدلیہ کا قیام بھی ضروری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس نظام میں مذہبی ماہرین کی کسی بالاتر جماعت کی گنجائش نہیں ہو سکتی جو مقننہ اور عدلیہ کے فیصلوں کو رد کرنے کا اختیار رکھتی ہو۔"

"اس معاملہ میں مَیں نے اسلام کے اصولِ اجماع سے بھی رہنمائی حاصل کی ہے جیسا کہ میں اس کو سمجھتا ہوں۔ ایک مکتبِ فکر کے نزدیک اجماع ان مجتہدین کی متفقہ رائے کا نام ہے جو اپنے علم کی بنا پر فیصلہ طلب مسئلے میں رائے ظاہر کرنے کے اہل ہوں۔ دوسرے مدرسۂ فکر کے نزدیک تمام مسلمانوں کی اکثریت جس بات پر متفق ہو جائے وہی اجماع ہے۔ پھر ایک تیسرا نظریہ یہ ہے کہ دورِ جدید میں اجماع سے مراد مقننہ کی وہ رائے ہے جو وہ عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور یہ اختیار علماء کی کسی جماعت کو نہیں بلکہ مقننہ کو حاصل ہے کہ وہ عوام کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے معاملات کے متعلق اپنی آزادانہ رائے دے۔ میں اِن سارے مسائل پر خود کوئی فیصلہ دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے یہ کام میں نے عوام کے نمائندوں پر چھوڑ دیا کہ وہی یہ طے کریں کہ قرآن و سنت سے تعلق رکھنے والے معاملات میں رائے قائم کرنے کی کیا شکل وہ پسند کرتے ہیں۔ البتہ مَیں نے یہ ضروری سمجھا کہ ایک اسلامی مشاورتی کونسل قائم کر دی جائے جس کی پُشت پر ایک اسلامی تحقیقی ادارہ ہو، تاکہ وہ مقننہ کو اسلام کی اساس پر قوانین بنانے میں مدد دے سکے (ص ۱۹۸-۱۹۹)

ان تصریحات کے بعد وہ علماء کی طرف توجہ فرماتے ہیں:

"مجھے معلوم تھا کہ علماء اس انتظام سے مطمئن نہ ہونگے وہ اس بات کے دعویدار ہیں کہ اسلام سے تعلق رکھنے والے معاملات میں تعبیر اور فیصلہ کا حق صرف انہی کو حاصل ہے۔ مگر یہ دعویٰ رکھنے کے باوجود انہوں نے ایک مفصّل دستور بنا کر پیش کر دینے سے گریز کیا کیونکہ انہیں خشیہ تھا کہ اگر کوشش کرنے سے ان کے اندرونی اختلافات ابھر کر سامنے آجائیں گے۔ اُن کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ حکومت ایک اسلامی دستور بنانا قبول کرے اور اس فیصلے کو علما پر چھوڑ دے کہ کونسا قانون اسلامی ہے اور کونسا غیر اسلامی۔ (ص ۱۹۹-۲۰۰)

اس کے بعد انہوں نے علماء کے سیاسی کردار پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ جو لوگ تحریکِ پاکستان کے مخالف اور قائداعظم کے دشمن تھے، پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد انہوں نے حصولِ اقتدار کے لیے چور دروازے سے داخل ہونے کی کوششیں شروع کیں اور اسلامی دستور کا نعرہ بلند کر کے اپنی گری ہوئی ساکھ کو بحال کرنے کا عزم کیا۔ اس سلسلے میں صدر محترم فرماتے ہیں:

"یہ وہ صورتِ حال ہے جس میں علماء نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اسلامی دستور کا مطالبہ پیش کیا۔ چونکہ کسی نے بھی اسلامی دستور کے بنیادی عناصر کا تعیّن نہیں کیا تھا اس لیے کوئی ایسا دستور اسلامی کہلانے کا مستحق نہ ہو سکتا تھا جسے علماء کی تبریک و تائید حاصل نہ ہو۔ اسلامی دستور کے نفاذ کا بس ایک ہی راستہ تھا کہ ملک علماء کے حوالہ کیا جائے اور پھر اُن سے التجا کی جائے کہ حضور براہِ کرم رہنمائی کیجیے۔ یہ تھی مختصر طور پر وہ بات جو علماء چاہتے تھے۔ کوئی دستور اُسی صورت میں اسلامی کہلا سکتا تھا جبکہ اُسے علماء مرتب کرتے اور پھر انہیں لوگوں کے معاملات کا حکم اور منتظم بننے کا اختیار دے دیا جاتا۔ یہ بات نہ عوام کے لیے قابلِ قبول تھی اور نہ میں اسے ماننے کے لیے تیار تھا، کیونکہ یہ جمہوریت کے اِس بنیادی اصول کے خلاف تھی کہ اقتدار کا اصل منبع عوام ہیں (ص ۲۰۳-۲۰۴)۔

اس بحث میں صدر صاحب نے علماء کی دو اقسام کے درمیان واضح طور پر فرق کیا ہے۔ ایک سیاسی علماء دوسرے غیر سیاسی علماء۔ وہ فرماتے ہیں:

"میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں یہاں علماء کے اُس طبقے کا ذکر کر رہا ہوں جو علانیہ سیاست میں مشغول تھے۔ اُن خدا ترس لوگوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جنہوں نے قرآن کی تعلیم دے کر اور اسلام کے پیغام کی اشاعت کر کے بڑے ایثار، انکسار اور انہماک کے ساتھ قوم کی خدمت کی ہے۔ میں جن سیاسی علماء کی بات کر رہا ہوں وہ وہ لوگ ہیں جو مسلم قوم پرستوں کے مقابلے میں ہندی قوم پرست مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور یا تو انڈین نیشنل کانگرس کے ممبر تھے یا دوسری اُن جماعتوں اور تنظیموں میں شامل تھے جو کانگرس کی موافقت میں کام کر رہی تھیں۔" (ص ۲۰۱)

یہ اقتباسات خاصے طویل ہو گئے ہیں۔ مگر یہ ضروری تھا کہ اس مسئلے کے سارے پہلوؤں کے متعلق صدر صاحب کے نقطۂ نظر کو ان کے اپنے الفاظ میں پیش کیا جائے تاکہ لوگ اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ سکیں۔ اب جو سوالات اس پر پیدا ہوتے ہیں انہیں ہم مختصراً عرض کرتے ہیں۔

اوّلین سوال جو اس بحث کو پڑھ کر آدمی کے ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۶۱ء میں مسلم فیملی لاز آرڈی ننس کا نفاذ و اعلان کیا اُن اصولوں کے مطابق ہوا تھا جو صدر صاحب نے خود ارشاد فرمائے ہیں؟ ان کا بیان یہ ہے کہ یہ اصول انہوں نے ۱۲ اپریل ۱۹۵۹ء کو مرتب کیے تھے (ص ۱۹۶) - اور عائلی قوانین کا آرڈی ننس اس کے دو سال بعد نافذ کیا گیا۔ اس آرڈی ننس کی تاریخ اُنہوں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۶ - ۱۰۷ پر یہ بیان کی ہے کہ ۱۹۵۵ء میں چند فاضل اصحاب پر مشتمل ایک کمیشن مسلمانوں کے عائلی قوانین کے متعلق سفارشات پیش کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ پر سابق حکومت نے علماء کے خوف سے کوئی کارروائی نہیں کی۔ صدر صاحب نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد چند ممتاز قانون دانوں سے، جن میں جسٹس محمد ابراہیم اور سابق چیف جسٹس منظور قادر صاحب شامل تھے، اس کی سفارشات

(باقی صفحہ ۶۵ پر)

(بقیہ اشارات)

کے بارے میں مشورہ لیا، اور پھر مارچ ۱۹۶۱ء میں ایک آرڈی ننس کے ذریعہ ان کو نافذ فرما دیا۔ سوال یہ ہے کہ اس کمیشن کی رپورٹ کیا عوام کی نمائندہ کسی مجلس مقننہ کے سامنے پیش کی گئی ہے اور کیا ایسی کسی مجلس نے اس کی سفارشات کو منظور کر کے مسلمانوں کے لیئے یہ عائلی قانون بنایا ہے اور کیا اس قانون کے بنانے سے پہلے ملک میں کوئی کھلا مباحثہ بھی ہوا جس سے عوام کے سامنے ہر نقطۂ نظر کے دلائل آئے ہوں اور یہ پتہ چلا ہو کہ عام مسلمانوں کی اکثریت اس معاملہ میں کیا رائے رکھتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی سوال کا جواب بھی اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ پھر ہم نہیں سمجھ سکے کہ کمیشن کے سات ارکان، خواہ وہ کیسے ہی فاضل ہوں، اور جسٹس ابراہیم اور جسٹس منظور قادر جیسے چند ماہرین قانون، خواہ ان کا علمی مرتبہ کتنا ہی بلند ہو، اس بات کے کس بنا پر اہل قرار پا گئے کہ تمام مسلمانوں کی زندگی سے جو مسائل متعلق تھے ان کے بارے میں اسلامی اصولوں کا تعین وہ کر دیں اور اس کو ایک فرمان کے ذریعہ سے نافذ کر دیا جائے؟ کیا اس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ اسلامی اصولوں کے تعین کی اہلیت سے صرف علمائے دین ہی محروم ہیں، دوسرے فضلاء یہ اہلیت رکھتے ہیں؟ اور دوسرے فضلاء جب اپنی

یہ اہلیت استعمال کریں تو کیا ان کی رائے کو قانون کی شکل دینے کے لیے وہ جمہوری طریق کار اختیار کرنا ضروری نہیں ہے جس کا صدر صاحب نے ذکر فرمایا ہے؟ اس مقام پر اصول اور عمل کے درمیان ایک واضح تضاد محسوس ہوتا ہے جسے رفع کر دیا جاتا تو بہت مناسب تھا۔

صدر صاحب نے فرمایا ہے کہ انہوں نے اسلامی نظام قائم کرنے کا یہ طریق کار پسند نہیں فرمایا کہ اسلامی اقدار، اصول اور احکام متعین کرنے کا کام وہ خود کریں اور فرمان (DECREE) کے ذریعہ سے اس کو نافذ کر دیں۔ اس کے بجائے جو طریق کار انہوں نے پسند فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ عوام کے آزادانہ انتخاب سے جو مجلس مقننہ منتخب ہو اسے ان امور کے فیصلے کا آخری اختیار دیا جائے، اس کو مدد اور مشورہ دینے کے لیے ایک مجلسِ مشاورت اور ادارۂ تحقیقات اسلامی موجود ہو، اور ایک آزاد عدلیہ یہ فیصلہ کرے کہ مقننہ اور انتظامیہ کہیں اپنے آئینی حدود سے تجاوز تو نہیں کر گئی ہیں۔ اِس طریق کار کے متعلق انہوں نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہی جمہوری طریقہ ہے، اور مقننہ اور عدلیہ کے اوپر علماء کے کسی گروہ کو جج بنا کر بٹھا دینا جمہوریت کے خلاف ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا جمہوری طریق کار صرف اِسی قدر ہے، یا اس کے علاوہ بھی اس طریق کار کی کچھ تفصیلات اور اس کے کچھ لوازم اور تقاضے ہیں جنہیں پُورا کیے بغیر یہ ٹھیک کام نہیں کر سکتا؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ایک جمہوری طریق کار کے صحیح طور پر کام کرنے کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ملک میں پریس اور پلیٹ فارم آزاد ہوں جن کے ذریعہ سے عوام ہر نقطۂ نظر کو اور اس کے دلائل کو اچھی طرح جان سکیں اور یہ رائے قائم کر سکیں کہ انہیں، یا ان کی اکثریت کو کون سی رائے قبول کرنی ہے اور کونسی رد کر دینی ہے۔ اسی طرح عوام کے صحیح نمائندے کسی مجلسِ مقننہ میں صرف اُسی وقت آ سکتے ہیں جبکہ عوام نے ان کو منتخب کرنے کا ایک طریقہ خود تجویز کیا ہو۔ اب یہ بات آخر کس کو معلوم نہیں ہے کہ بلا واسطہ طریقِ انتخاب کے بجائے بنیادی جمہوریتوں کے واسطے سے اپنے نمائندے چننے کی پابندی عوام نے اپنے اوپر آپ عائد نہیں کر لی ہے بلکہ وہ اس کے پابند کیے گئے ہیں۔ اور یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ تحریر و تقریر

پر ہمارے ملک میں کیا پابندیاں عائد ہیں، اور ان کی موجودگی میں اہم مسائل پر کھلا مباحثہ کتنا مشکل ہو چکا ہے۔ اب اگر لوگ نہ آزادی کے ساتھ ہر نقطۂ نظر کو سن کر رائے قائم کرنے کے قابل ہو سکیں، نہ اپنے نمائندے اپنی مرضی کے مطابق چن سکیں، تو وہ جمہوری طریقِ کار کیسے چل سکتا ہے جس سے اسلامی اقدار، اصول اور احکام کا تعین قابلِ اطمینان طریقے سے ہو سکے؟ رہی مجلسِ مشاورت اور ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کی امداد، جو ان امور کے تعین میں مشورہ دینے کے لیے فراہم کی گئی ہے، تو وہ بھی اُسی صورت میں مفید ثابت ہو سکتی ہے جبکہ اس میں وہ لوگ لیے جائیں جن کی اسلام سے واقفیت اور خدا ترسی پر مسلم عوام کو اعتماد ہو۔ اس بارے میں ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ پاکستان کے مسلم عوام میں سے کتنے فی صدی، یا کتنے فی ہزار لوگ اپنا دین جاننے کے لیے ان اداروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

علماء کے متعلق صدر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سب سے زیادہ وہ علماء پسند ہیں جو سیاست، یعنی اپنے ملک کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اِس نقطۂ نظر کی معقولیت ہم نہیں سمجھ سکے ہیں۔ ایک طرف صدر صاحب کے نزدیک اسلام زندگی کو الگ الگ شعبوں اور دائروں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ وہ پوری انسانی زندگی کو ایک اکائی قرار دیتا ہے اور اس کے لیے جامع اور ہمہ گیر ہدایات دیتا ہے۔ دوسری طرف اسلام کا پسندیدہ عالم اُن کے نزدیک وہ ہے جو ملک کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہ لے اور ان سے الگ تھلگ رہ کر بس قرآن کی تعلیم اور اسلام کے پیغام کی تبلیغ میں لگا رہے۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس اسلام کی تبلیغ کرے گا؟ آیا اسی اسلام کی جو زندگی کے سارے معاملات پر اپنا حکم چلانا چاہتا ہے اور ہر پہلو میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے؟ یا کسی ایسے اسلام کی جسے ملک کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہے؟ اور یہ بات بھی سمجھ میں نہ آسکی کہ جب اپنے ملک کے معاملات چلانے میں حصّہ لینا صدر صاحب کے نزدیک عوام کا ایسا حق ہے "جسے نہ محدود کیا جا سکتا ہے اور نہ اس معاملہ میں کسی مصالحت کی گنجائش ہے" تو عوام کے ایک خاص عنصر یعنی علماء کے لیے یہ حق کن وجوہ سے باطل ہو جاتا ہے؟ عجیب بات ہے کہ جس حق کو سرکاری ملازم تک استعمال کر رہے ہوں وہ علماء کے لیے شجرِ ممنوع ہو۔

رہے "سیاسی علماء" تو ان کی صرف ایک ہی قسم کا انہوں نے ذکر فرمایا ہے جو ہندوستانی قوم پرست تھے اور یا تو براہِ راست کانگریس کے ممبر تھے یا اس کے ساتھ مل کر کام کرنے والی کسی تنظیم میں شامل تھے۔ لیکن اس ملک میں اُن کے علاوہ "سیاسی علماء" کی دو قسمیں اور بھی ہیں جن کا انہوں نے ذکر نہیں فرمایا ہے۔ ایک قسم اُن علماء کی ہے جو سیاست میں تو حصہ لیتے ہیں مگر حزبِ اختلاف کی حیثیت سے نہیں بلکہ حکومت کے حامی گروہ کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سیاست سے ان کی دلچسپی بھی ناپسندیدہ ہے یا نہیں؛ دوسری قسم اُن علماء کی ہے جنہوں نے کبھی کانگرس کا ساتھ نہیں دیا بلکہ علانیہ اس کی مخالفت کی اور پاکستان کی تحریک میں اُسی سرگرمی کے ساتھ کام کیا جس کے ساتھ مسلم لیگ کا کوئی بڑے سے بڑا کارکن کام کر رہا تھا۔ تقسیم کے بعد اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے میں پیش پیش یہی تیسرا گروہ تھا نہ کہ پہلا گروہ جسے ایک مدت تک پبلک میں آنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ سوال یہ ہے کہ علماء کے اِس گروہ کا یہ حق ماننے سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ جس ملک کے بنانے میں انہوں نے حصہ لیا ہے اس کے آئندہ نظام پر گفتگو کریں؟ ان کی سیاست سے دلچسپی اگر ناپسندیدہ تھی تو اُس وقت بھی ناپسندیدہ ہی ہونی چاہیے تھی جب وہ پاکستان کی تحریک میں حصہ لینے کے لیے آگے بڑھے تھے۔ اُس وقت اُن کے اِس حق کا انکار کیوں نہ کیا گیا؟ اور ان پر معترض آخر وہ لوگ کیسے ہو سکتے ہیں جنہوں نے پاکستان کے بنانے میں سرے سے کوئی حصہ لیا ہی نہیں ہے؟

صدر صاحب کا یہ فرمانا ہمارے علم کی حد تک واقعہ کے مطابق نہیں ہے کہ علماء اس بات کے مدعی ہیں کہ جس چیز کو وہ اسلامی کہیں اسے اسلامی مان لیا جائے اور جس چیز کو وہ خلافِ اسلام کہیں اسے خلافِ اسلام تسلیم کر لیا جائے، یا یہ کہ احکامِ اسلامی کی تعبیر کا حق صرف انہی کو حاصل ہے اور انہیں لیجسلیچر اور عدلیہ دونوں پر حکم بنا کر بٹھا یا جائے یا ان کو وہ ویٹو کے اختیارات دے دیئے جائیں۔ اگر پاکستان کے کسی عالم، یا علماء کی کسی جماعت نے کبھی اپنی کسی تحریر، یا تقریر یا قرارداد میں ایسی کوئی بات کہی ہو تو ہم ضرور یہ چاہیں گے کہ اس کا حوالہ دیا جائے۔ صدرِ مملکت جیسی عالی مرتبہ شخصیت کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنی قوم

کے کسی گروہ پر ایسا الزام لگا دیں جس کا کوئی ثبوت نہ ہو، اور وہ گروہ اس کا قطعی منکر ہو۔

علماء جو بات کہتے ہیں وہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے قول کو سند مان لیا جائے، بلکہ وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ اصل سند خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔ اصل اسلامی احکام، اقدار اور اصول وہ ہیں جو کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ سے ثابت ہوں۔ ہم کتاب و سنت کی دلیل سے جس بات کا اسلامی ہونا ثابت کریں، اس سے اختلاف کرنے والا کتاب و سنت ہی سے اپنی دلیل لائے اور بے دلیل کسی کی بات بھی تسلیم نہ کی جائے۔ بات اُسی کی چلنی چاہیے جس کی دلیل مضبوط ہو۔ اور اس بات کا فیصلہ کہ دلیل کس کی مضبوط ہے، آخر کار مسلمانوں کی عام رائے ہی کرے گی، کیونکہ امتِ مسلمہ کا سوادِ اعظم کبھی ایسی بات کو قبول نہیں کرتا جو مضبوط دلائل کے ساتھ کتاب و سنت سے ثابت نہ کی جا سکے ـــــ یہ ہے علماء کی اصل پوزیشن۔ اس پر کسی اعتراض کی گنجائش ہو تو ضرور کیا جائے۔

یہ بات غالباً صدر صاحب کے علم میں نہیں ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء نے جنوری ۱۹۵۱ء میں بالاتفاق اسلامی دستور کے بنیادی اصول مرتب کر کے پیش کر دیئے تھے اور انہیں ایسا کوئی خدشہ لاحق نہیں ہوا تھا کہ "ان کے اندرونی اختلافات اُبھر کر سامنے آجائیں گے"۔ پھر دسمبر ۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین مرحوم نے دستور ساز اسمبلی کے سامنے جو دستوری سفارشات پیش کی تھیں، علماء نے اس کے اِس جُزو سے اتفاق نہیں کیا تھا کہ کسی مسودۂ قانون پر خلافِ اسلام ہونے کا اعتراض اگر کبھی ہو تو وہ علماء کے ایک بورڈ کے سامنے پیش کیا جائے، بلکہ انہوں نے اُسی جمہوری طریقِ کار کی حمایت کی تھی جسے آج صدر صاحب پیش فرما رہے ہیں۔ اُن دستوری سفارشات پر علماء کا تبصرہ شائع شدہ موجود ہے۔ انہوں نے اس میں کہا تھا کہ تمام قوانین معروف جمہوری طریقے پر ہی مجالسِ قانون ساز میں پاس ہونے چاہییں، اور مجلسِ قانون ساز کے پاس کیے ہوئے دوسرے قوانین کے متعلق جس طرح سپریم کورٹ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ دستور کے حدود سے متجاوز ہیں یا نہیں اسی طرح یہ فیصلہ بھی سپریم کورٹ ہی کے سپرد کر دینا چاہیے کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف ہے یا نہیں۔ البتہ جس وقت تک ہمارے ملک میں نئے دستور کے تقاضوں کے مطابق کتاب و سنت میں بصیرت رکھنے والے فاضل جج تیار نہ ہوں اس وقت تک کے لیے سپریم کورٹ میں چند ایسے

عالم مقرر کر دیئے جائیں جو ان مسائل کا تصفیہ کرنے میں دوسرے ججوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے سپریم کورٹ میں لیے جانے والے علماء کے لیے اہلیت کی ویسی ہی کڑی شرائط تجویز کی تھیں جیسی دوسرے ججوں کے لیے دستور میں رکھی گئی ہیں۔ کیا اس کے بعد علماء پر وہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو صدر صاحب نے کیے ہیں؟ ماہرینِ فن کی مدد کے ناگزیر ہونے کو تو وہ خود بھی مانتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اسلامی مشاورتی کونسل اور ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کی ضرورت محسوس فرمائی ہے۔

آخر میں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے۔ صدرِ محترم نے مولانا سید ابوالاعلیٰ کو نیشنلسٹ علماء کے زمرے میں شامل کیا ہے اور اُن کا نام لے کر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ شدت کے ساتھ پاکستان کے مخالف تھے۔ جہاں تک پاکستان کی مخالفت کے الزام کا تعلق ہے، یہ سرکاری طور پر سب سے پہلے اس وقت لگایا گیا تھا جب ۱۹۶۴ء میں ان کو نظر بند کیا گیا تھا، اور اس کا نہایت مفصل جواب انہوں نے اسی وقت دے دیا تھا جو شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس میں انہوں نے حکومت کو چیلنج کیا تھا کہ وہ کسی عدالت کے سامنے یہ ثابت کرے کہ وہ پاکستان بننے کے مخالف تھے، اور یہ بتائے کہ یہ مخالفت آخر کس شکل میں کی گئی تھی۔ کیا پاکستان بننے کے خلاف کوئی بیان شائع کیا تھا؟ جماعت اسلامی کے کسی اجلاس میں کوئی ریزولیوشن پاس کیا تھا؟ کوئی جلسہ کیا تھا؟ جلوس نکالا تھا؟ آخر وہ کام کیا تھا جس کی بنا پر اس الزام کی صداقت مانی جا سکے؟ یہ چیلنج آج بھی موجود ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات اُن کے خلاف کہی جا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان بنانے کی جدوجہد میں حصہ نہیں لیا تھا، اور یہی بات اتنی ہی صداقت کے ساتھ خود صدرِ محترم کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

رہا نیشنلسٹ علماء کے زمرے میں ان کا شمار تو مولانا کے بارے میں جو شخص معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی کانگریس میں شامل نہیں ہوئے، بلکہ مسلمانوں پر کانگریس کی حقیقت واضح کرنے اور اس کا طلسم توڑنے اور اُن کے اندر علیحدہ قومیت کا احساس پیدا کرنے میں انہوں نے جو کام کیا ہے وہ کسی دوسرے نے نہیں کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسی کام کی

بدولت تو کانگریسی علماء آج تک ان کو گالیاں دے رہے ہیں اور صدر صاحب ان کا شمار اسی گروہ میں فرما رہے ہیں غالباً ان کی کتاب "مسئلہ قومیت" صدر صاحب کی نگاہ سے نہیں گزری ہے، اور نہ انہوں نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے تینوں حصّوں کا مطالعہ فرمایا ہے۔ ورنہ اُن سے یہ ہرگز امید نہ تھی کہ ایسی بے اصل بات ان کے قلم سے نکلتی۔

پاکستان آج جس خطۂ ارض کا نام ہے وہ مسلمانوں کے اندر الگ قومیّت کے احساس کی پیداوار ہے۔ اس احساس کے بیدار کرنے اور اسے قوت و توانائی بہم پہنچانے میں مولانا تحریک پاکستان کے کسی بڑے سے بڑے مبلّغ اور داعی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ باقی جہاں تک پاکستان کی موجودہ جغرافیائی ہیئت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں اس ملک کے معرضِ وجود میں آنے سے چند روز پیشتر تک کوئی بات حتمی اور یقینی طور پر نہ کہی جا سکتی تھی۔ شملہ کانفرنس کے ناکام ہونے کے بعد کیبنٹ مشن نے کانگرس اور مسلم لیگ کے سامنے جو پلان پیش کیا تھا وہ آج کے پاکستان سے قطعی مختلف تھا۔ اس میں ایک ایسی حکومت کے قیام کی تجویز تھی جس میں خارجی پالیسی، دفاع اور ذرائع آمد و رفت مرکز کے ہاتھ میں ہوں اور باقی امور کے انتظام و انصرام میں صوبے آزاد ہوں۔ پورا ملک آبادی کے اعتبار سے تین حلقوں پر مشتمل ہو اور یہ حلقے اپنی ضروریات اور حالات کے مطابق تغیّر و تبدّل کرنے میں آزاد ہوں۔ قائداعظم مرحوم یہ تجویز ماننے پر راضی نہ تھے مگر انہوں نے وسیع تر مفادات کی خاطر اسے تسلیم کر لیا۔ اس پر مختلف اخبارات میں جو تبصرے شائع ہوئے ان میں قائدِ اعظم کی بصیرت کی داد دیتے ہوئے یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے اس برِ صغیر کے وسیع تر مفادات کے پیشِ نظر پاکستان کے مطالبہ تک کو قربان کر کے بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے[1]۔

مسلمانوں خصوصاً لیگ سے وابستہ لوگوں کو اس کا بڑا صدمہ ہوا مگر انہوں نے اس تجویز کو قائداعظم کے کہنے پر تسلیم کر لیا۔ دوسری طرف کانگرس بھی اسے مان گئی۔ مگر پنڈت نہرو کے ایک غیر دانشمندانہ

---

[1] THE STRUGGLE FOR PAKISTAN از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صفحہ ۲۶۵

بیان نے سارے معاملے کو خراب کر دیا اور لیگ کو اس تجویز کے رد کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ اب ذرا آپ خود ہی خود ہی غور فرمائیں کہ اگر پنڈت نہرو سے یہ غلطی سرزد نہ ہو جاتی تو پھر تقسیم کا نقشہ یا پاکستان کی صورت موجودہ صورت سے کتنی مختلف ہوتی جب قائد اعظم تک پاکستان کی موجودہ ہیئت کے علاوہ دوسری ہیئت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے تو اگر کوئی دوسرا شخص مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لیے کوئی دوسرا نقشہ اپنے ذہن میں رکھتا ہو تو اسے پاکستان کا دشمن آخر کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟

کسی شخص کی قومی اور ملّی وفاداری کو جانچنے اور اس پر حکم لگانے کا یہ انداز بالکل غلط ہے کہ اُس نے کسی تحریک کی ہر مرحلے پر ہر قسم کے حالات کے اندر پوری پوری تائید کیوں نہیں کی۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے تو پھر ہر صاحب رائے آدمی پر غداری کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ کسی فرد کی ملّت دوستی کا اندازہ کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس نے ملّی اور قومی مفادات کے تحفظ کے لیے کیا کوششیں کیں۔ تدابیر کے اختلافات، یا راہ عمل کے فرق سے کوئی فرد یا گروہ ملک و ملّت کا دشمن نہیں بن جاتا۔

ضروری اعلان

۱۔ خریدارانِ ترجمان القرآن سے ضروری التماس ہے کہ خط و کتابت اور منی آرڈر بھیجتے وقت اپنا پتہ مکمل اور خوشخط لکھا کریں اور اپنا نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں جو کہ آپ کے پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ ورنہ عدم تعمیل کی ذمہ داری دفتر پر عائد نہ ہوگی۔

۲۔ اجرائے رسالہ کے لیے پیشگی چندہ ارسال کریں یا وی۔ پی کی اجازت دیجیے۔ قرض یا وعدہ پر رسالہ جاری نہیں کیا جاتا۔

مینجر ترجمان القرآن